محمد اطہر مغل*

اہلِ زبان کا علمِ قواعد پر تشکیکی رجحان

The Skeptical Attitude of Native Speakers Toward the Science of Grammar

Abstract: This article explores why native speakers often remain skeptical or indifferent toward formal grammar, frequently believing that subconscious linguistic competence is sufficient for communication. It distinguishes between the "traditional grammar" that enforces rigid rules of "correctness" and "modern grammar," which seeks to scientifically describe linguistic reality without passing judgment. The text argues that while basic communication may not require formal study, a conscious understanding of grammatical structures is essential for creative expression, avoiding ambiguity, and mastering diverse linguistic environments. Furthermore, it highlights how modern linguistics has moved away from viewing grammar as a purely logical construct, recognizing instead that every language reflects its own unique cultural and spatial reality.

Keywords: Native Speakers, Traditional Grammar, Modern Linguistics, Skepticism, Linguistic Competence, Urdu Grammar, Descriptive Rules.

تلخیص: یہ مقالہ اس امر کا جائزہ لیتا ہے کہ اہلِ زبان عموماً قواعد کی ضرورت سے کیوں انکاری رہتے ہیں اور اسے محض ایک لاشعوری عمل کیوں سمجھتے ہیں۔ تحریر میں "روایتی قواعد"، جو صحیح اور غلط کے سخت قوانین وضع کرتی ہے، اور "جدید قواعد" کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے جو زبان کا سائنسی اور توضیحی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ مقالے کے مطابق، اگرچہ عام بول چال کے لیے قواعد کا علم ضروری نہیں معلوم ہوتا، لیکن زبان کے تخلیقی استعمال، ابہام سے بچنے اور اظہارِ بیان میں نفاست پیدا کرنے کے لیے قواعد کا شعوری ادراک ناگزیر ہے۔ مزید بر آں، یہ واضح کیا گیا ہے کہ جدید لسانیات نے قواعد کو منطق کی غلامی سے آزاد کر کے اسے ہر زبان کی اپنی روایات اور خارجی دنیا کی ترجمانی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

کلیدی الفاظ: اہلِ زبان، روایتی قواعد، جدید لسانیات، تشکیکی رجحان، لسانی مہارت، اردو قواعد، توضیحی قواعد۔

* اے ایس ٹی، پکسی ڈیل 1 گورنمنٹ بوائز ایلیمنٹری لوئر سیکنڈری اسکول، شمالی کراچی، کراچی۔

اہلِ زبان عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمیں قواعد جاننے کی کیا ضرورت ہے! ہم اپنی بات بآسانی معقول الفاظ میں کر سکتے ہیں اور دوسروں کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ مگر کیا زبان کا اتنا استعمال کافی ہے؟ عام ذہن زبان کے محض برت لینے سے مطمئن ہو جاتا ہے مگر خواص کی تشفّی نہیں ہو پاتی۔ بے شک زبان کا مکمّل احاطہ ممکن نہیں مگر علمِ لسان کے ماہرین نے اسے سمجھنے کے لیے قریباً ہر زمانے میں قواعد منضبط کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ علوم کی ترقّی نے روایتی قواعد کے متوازی کئی اور اقسام کے قواعد کو بھی جنم دیا ہے مثلاً توضیحی قواعد، تبادلی قواعد، تاریخی قواعد، تقابلی قواعد، تخالفی قواعد، عملی قواعد تدریسی قواعد حوالہ جاتی قواعد[1]۔ غرض جو اہلِ زبان براہِ راست اس علم سے واسطہ نہیں رکھتے وہ اس کی جدید اصطلاحات سے حیران ہوتے ہیں حالانکہ یہ وہی ساری چیزیں ہوتی ہیں جنھیں وہ لاشعوری طور پر اچھی طرح جانتے ہیں لیکن ان کے لیے قائم کردہ قواعدی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے ہیں۔

عوام سے قطعِ نظر خواص کے نزدیک زبان کا شعوری ادراک بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر اہلِ زبان، زبان سے محض روزمرہ کے کام لینا چاہتے ہیں تو یقیناً انھیں قواعد کی اصطلاحوں اور ان کے باہمی ربط اور نتیجتاً معینت کی وسعتوں کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر اہلِ زبان اپنی زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کرنا چاہتے ہیں، جو خیال اور جذبے سے مملو ہو اور معینت کے جہانِ تازہ تک رسائی کرتی ہو تب زبان کی ساخت اور اس کے پورے نظام پر گرفت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ تخیل اور جذبہ دونوں بے کنار سمندر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑا ادیب یا شاعر قواعد سے بے بہرہ نہیں ملے گا۔

اہلِ زبان، زبان کے معیار کی بحث میں الجھتے ہیں اور غیر اس بحث سے قطعِ نظر زبان کی قواعد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وضاحت کے لیے اردو زبان بطورِ مثال دیکھی جا سکتی ہے۔ جس کے بولنے والے مختلف لہجوں کو ایک دوسرے پر فوقیت دیتے نظر آتے ہیں۔ "غیر معیاری زبان" اور "معیاری زبان" کی اصطلاحیں بھی بناتے ہیں جب کہ معیاری زبان بھی اتنی ہی فطری ہے جتنی غیر معیاری زبان[2]، فوقیت کی معقول وجہ سمجھ نہیں آتی کیونکہ لہجوں کا اختلاف قدرتی چیز ہے۔ جب کثیر لسانی خطے میں بین علاقائی زبان مثلاً اردو بولی جاتی ہے تو غیر شعوری طور پر اسے علاقائی زبان کے لہجے میں بولتے ہیں۔ اسی لیے لہجے اور لفظیات کے اعتبار سے پنجاب، میسور، مہاراشٹر اور مدراس کی اردو میں وہاں کے مقامی رنگ ہیں۔ مذکورہ علاقے تو پھر بہت فاصلوں پر ہیں خود "معیاری اردو" کے علاقے اترّ پردیش میں بھی پنجابی پن، ہریانوی پن، بھاکا پن اور اودھی پن نمایاں ہے۔ اور اس کی ایک وجہ اترّ پردیش کی جغرافیائی وسعت بھی ہے۔ غرض برصغیر کے ہر خطے میں اردو وہاں کے مقامی رنگ میں بولی جاتی ہے۔ لہجے تلفظ اور صرفی و نحوی اختلافات کے علاوہ محاورے بھی ترجمہ ہو کر اردو میں شامل ہوتے جاتے ہیں[3]۔

دوسری طرف غیر اہلِ زبان، جنھیں زبان سے واجبی آشنائی ہوتی ہے، انھیں زبان سیکھنے کے لیے قواعد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پہلی قواعدِ اردو 1698ء میں کیٹلر Ketelaar نے "گریمیٹکا ہندوستانیکا" Grammatical Hindustanica کے نام سے

ولندیزی Dutch زبان میں لکھی۔ اس کے بعد ملز Mills، شُلز Schultze، ہیڈلے Hadley، گلکرسٹ Gilchrist، شیکسپیئر Shakespear، پرائس Price، گارسیں دتاسیGarcin de Tassy، ییٹس Yates، ڈنکن فوربس Duncan Forbesنے بھی اپنی اپنی قواعد میں اردو زبان کے اصولوں کو منضبط کیا۔ آخری مشہور قواعد جان ٹی پلیٹس John T. Plattsنے ۱۸۷۴ء میں لکھی۔ قواعد کی اہمیت اہلِ زبان میں تقریباً ایک صدی بعد پیدا ہوئی۔ ۱۸۰۷ء میں انشاء نے دریائے لطافت فارسی میں لکھی۔ ۱۸۴۰ء میں سر سید احمد خان نے اردو کی قواعد پہلی بار اردو زبان میں "قواعدِ صرف و نحوِ زبانِ اردو" کے نام سے لکھی۔ پھر امام بخش صہبائی، فتح محمد جالندھری اور مولوی عبد الحق وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ بعد ازاں اردو دان طبقہ سائنسی علوم کی ترقی میں مغرب کا ساتھ نہ دے سکا تو انگریزی زدہ ہو گیا اور دیگر علوم کی طرح قواعد بھی انگریزی ہی میں ترقی کرتے رہے[4]۔

اہلِ زبان کے قواعد سے گریز کی ایک وجہ روایتی قواعد بھی ہے جو ہدایتی و امتناعی ہے اور صحیح بولنے اور لکھنے کے قوانین وضع کرتی ہے، اور کلاسیکی زبان کے نمونوں کو صحت و غلطی کا معیار مقرر کرتی ہے۔ مزید یہ کہ زبان کے غائر مطالعے سے کچھ ٹھوس اور جامع اصول وضع کر کے ان کی پابندی پر اصرار کرتی ہے[5]۔ روایتی قواعد کے ان اصولوں کو اہلِ زبان کی طرح جدید قواعد بھی تسلیم نہیں کرتی، اس لیے قواعد سے گریز کرنے والے اہلِ زبان اور جدید قواعد میں بُعد نہیں ہونا چاہیے۔ جدید قواعد صرف اصول دریافت کرتی ہے پیشہ ورانہ قوانین نہیں بناتی۔ اور اگر کوئی وسیع ترجماعت کسی اصول سے انحراف کرے تو اس اصول کو بھی رد کر دیتی ہے۔ جدید قواعد کا بنیادی مقصد اختلافات کا وقوعی بیان ہے، تحقیر و تضحیک نہیں ہے۔ ساتھ ساتھ وہ توضیح و تشریح کرتی ہے مگر صحیح یا غلط کا حکم نہیں لگاتی[6]۔

قواعد سے گریز کی دوسری بڑی وجہ قدیم فلاسفہ کا وہ نقطۂ نظر ہے جس کے تحت قوانین قدرت کی طرح زبانیں بھی منطقی اصولوں کی پابند ہوتی ہیں[7]۔ ارسطو نے سب سے پہلے اسم اور فعل کی منطقی تعریفیں وضع کیں[8]۔ ایک عرصہ تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ قواعد اطلاقی منطق ہے اور زبان حقیقی و خارجی دنیا کی من وعن نمائندگی کرتی ہے۔ انیسویں صدی میں زبانوں کے یک زمانی مطالعے اور تقابلی لسانیات کی ترقی سے یہ بات سامنے آئی کہ قواعد کے اصول منطق کے پابند نہیں ہوتے۔ ہنری سویٹ اور بعد ازاں آٹو جیسپرسن نے جملے میں الفاظ کی حیثیت، وظیفہ اور معنی والے طریقہ کار پر کام کیا اور یہ بات سامنے آئی کہ خارجی دنیا کی ترجمانی کے لیے زبان منطقی اصولوں کی پابند نہیں بلکہ ہر زبان اپنی اپنی لسانی روایات کے تحت خارج کی ترجمانی کرتی ہے[9]۔

قواعد سے گریز کی تہ میں کچھ اعتراضات بھی پوشیدہ رہتے ہیں:

ا۔ زبان پہلے ہوتی ہے قواعد بعد میں بنتی ہے۔ اسی لیے زندہ زبان کو قواعد کے اصولوں میں جکڑا نہیں جا سکتا۔

۲۔ زبان برتنے سے آتی ہے۔ اسی لیے قواعد گھر بیٹھے کسی کو زبان نہیں سکھا سکتے ہاں کوئی شخص مخصوص علاقے میں رہ کر وہاں کی زبان میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔

۳۔ اہلِ زبان پیدائشی قواعد دان ہوتے ہیں، انہیں جملوں کی تعمیر اور اصولوں سے غیر شعوری واقفیت ہوتی ہے۔

پہلی قسم کے اعتراضات کی بنیادوں پر روایتی قواعد کو مساوی رکھ کر جدید قواعد خصوصاً توضیح اور تشریحی قواعد کی بنیاد رکھی گئی جو زبان کا کھلا خاکہ پیش کرتی ہیں اور اسے پابند نہیں کرتیں[10]۔ دوسری قسم کے اعتراضات زبان کے مقامی اور سطحی استعمال سے متعلق ہیں اور اس زمرے میں قطعی بجا ہیں۔ قدیم زمانوں میں جب دو تہذیبیں یکجا ہو جاتیں تو باہمی واقفیت اور انسیت کے لیے صدیاں درکار ہوتی تھیں جب کہ آج ذرائع مواصلات اور نقل و حمل کی ترقّی کے ساتھ ساتھ قواعدی اصولوں کے منضبط ہو جانے کے سبب زبانیں قریب آ گئی ہیں اور اب یہ کام دور رہ کر بھی بہت کم مدت میں طے پا جاتا ہے۔ تیسری قسم کے اعتراضات وجدانی نوعیت کے ہیں۔ مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ نطق ایک لاینحل عقدہ رہا ہے۔ پھر اس نطق کا استعمال متفرق گروہوں میں یکساں نہیں ہوتا۔ اپنے اپنے عملی رجحانات کے تحت زبان تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ زبان بھی زبان پر کلی گرفت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے ڈائلیکٹ dialect اور اس کے بھی اندر اپنے ماحول کے مطابق جملوں کی مخصوص ساختوں اور محدود ذخیرہ الفاظ سے کام چلا لیتے ہیں، مختلف ہنروں، کارخانوں اور کاروباری طبقوں کی زبانیں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن جب اہلِ زبان اپنے مخصوص ماحول کی بجائے دوسرے ماحول کے جملوں کی ساختوں اور ذخیرہ الفاظ کو استعمال کرتا ہے تو غلطی کا احتمال بہت بڑھ جاتا ہے۔ البتہ اگر اسے اپنے ماحول کی زبان کا شعوری علم ہو تو وہ قواعدی اصولوں کا انطباق کر کے دوسرے ماحول کی زبان کو بھی درستی کے ساتھ برت سکتا ہے۔

قواعد کا شعوری علم اہلِ زبان کو اظہارِ بیان کی نئی نئی راہیں دکھاتا ہے اور معنی میں ابہام سے بچا کر صراحت اور نفاست پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ان کے علاوہ یہ زبانوں کے تقابلی مطالعہ کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ زبانوں کے لسانی مزاج، سُر لہر، تان اور لے کے ساتھ ساتھ زبانوں کی عجیب و غریب خصوصیات بھی آشکار کرتا ہے مثلاً عربی زبان میں تفعیل کا وزن لفظ کے معنی کے "ہونے" کو "کرنے" یا "بنانے" میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے جدید "نیا" سے تجدید "نیا کرنا"، حُر "آزاد" سے تحریر "آزاد کرنا"، یا قرب "نزدیک" سے تقریب "قریب کرنا" وغیرہ۔ اسی طرح شمالی ایریزونا، امریکہ کی ہوپی Hopi زبان میں بجلی، لہر، شہابِ ثاقب، دھواں، حرکتِ قلب جیسے الفاظ اسم کی بجائے فعل مانے جاتے ہیں اور توجیہہ یہ کی جاتی ہے کہ قلیل وقتی واقعات اسم نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کینیڈا کے صوبے برٹش کولمبیا کی نوٹکا Nootka زبان کے الفاظ سے زمانی اور مکانی تصور الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اگر "گھر" کہنا ہے تو کہیں گے کہ "گھر واقع ہے" یا پھر لاحقے جوڑ کر "مدت تک قائم رہنے والا گھر" یا "عارضی گھر" وغیرہ[11]۔

مشاہدہ ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ کسی بھی چیز کی اہلیت حاصل کرلی جائے اس میں جتنا آگے بڑھیں وہ اور وسیع ہوتی چلی جاتی ہے۔ بلاشبہ زبان خداداد عطیہ ہے مگر عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اہلِ زبان میں جتنی زیادہ تعلیمی قابلیت ہو انھیں قواعد سے بھی اتنی ہی زیادہ واقفیت ہوتی ہے۔ گویا قواعد سے واقفیت اہلِ زبان کے تعلیم یافتہ ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے! پھر جب زبان کا دعویٰ ہے تو اس کے متعلقات سے گریز چہ معنی دارد۔

حوالہ جات:

۱۔ بیگ، مرزا خلیل احمد، **لسانی مسائل ومباحث**، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۹۔

1. University of Michigan Department of Linguistics, *Standard Language Ideology Statement*. Ann Arbor: University of Michigan. Available at: https://lsa.umich.edu/linguistics/about-us/values-statement/standard-language-ideology-statement.html (Accessed: [Insert Date]).

۳۔ چند، گیان، **لسانی مطالعے**، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ء، ص ۴۷–۴۹۔

۴۔ بیگ، مرزا خلیل احمد، **لسانی مسائل ومباحث**، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۰–۱۵۵۔

۵۔ بیگ، مرزا خلیل احمد، **لسانی مسائل ومباحث**، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۸ء، ص ۱۵۹۔

۶۔ بیگ، مرزا خلیل احمد، **لسانی مسائل ومباحث**، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۸ء، ص ۱۶۰۔

1. Wittgenstein, Ludwig, *Tractatus Logico-Philosophicus*. London: Lund Humphries, 1960, Proposition 3.032.
2. Aristotle, *On Interpretation*. Translated by E. M. Edgehill. Available at: www.bocc.ubi.pt.
3. Jespersen, Otto, *The Philosophy of Grammar*. London: George Allen & Unwin Ltd., 1924, p. 22.
4. Crystal, David, *The Cambridge Encyclopedia of Language*. 2nd ed. Cambridge: Cambridge University Press, 1997, pp. 2–3.
5. Whorf, Benjamin Lee, *Language, Thought and Reality*. New York: John Wiley & Sons, Inc.; Cambridge, MA: The Technology Press of the Massachusetts Institute of Technology, 1959, pp. 215–216.

کتابیات:

۱۔ بیگ، مرزا خلیل احمد۔ **لسانی مسائل ومباحث**۔ لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۸ء۔

۲۔ چند، گیان۔ **لسانی مطالعے**۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ء۔

3. Aristotle. *On Interpretation*. Translated by E. M. Edgehill. Available at: **www.bocc.ubi.pt**.

4. Crystal, David. *The Cambridge Encyclopedia of Language*. 2nd ed.
5. Jespersen, Otto. *Language: Its Nature, Development and Origin*. In *The Philosophy of Grammar*. PhilPapers, 1922.
6. University of Michigan, Department of Linguistics. **Standard Language Ideology Statement**. Available at: https://lsa.umich.edu/linguistics/about-us/values-statement/standard-language-ideology-statement.html
7. Whorf, Benjamin Lee. *Language, Thought and Reality*. Cambridge, MA: The Technology Press of the Massachusetts Institute of Technology; New York: John Wiley & Sons, Inc., 1959.
8. Wittgenstein, Ludwig. *Tractatus Logico-Philosophicus*. London: Lund Humphries, English Impression, 1960.

Bibliography

1. Aristotle. *On Interpretation*. Translated by E. M. Edgehill. Available at: **www.bocc.ubi.pt**.
2. Baig, Mirza Khalil Ahmad. *Lisani Masail wa Mabahis*. Lahore: Book Talk, 2018.
3. Chand, Gyan. *Lisani Mutala'at*. Lahore: Fiction House, 2018.
4. Crystal, David. *The Cambridge Encyclopedia of Language*. 2nd ed.
5. Jespersen, Otto. *Language: Its Nature, Development and Origin*. In *The Philosophy of Grammar*. PhilPapers, 1922.
6. University of Michigan, Department of Linguistics. *Standard Language Ideology Statement*. Available at: https://lsa.umich.edu/linguistics/about-us/values-statement/standard-language-ideology-statement.html.
7. Whorf, Benjamin Lee. *Language, Thought and Reality*. Cambridge, MA: The Technology Press of the Massachusetts Institute of Technology; New York: John Wiley & Sons, Inc., 1959.
8. Wittgenstein, Ludwig. *Tractatus Logico-Philosophicus*. London: Lund Humphries, English Impression, 1960.

☆☆☆☆☆